غزل

غزل ایک ایسی صنف سخن ہے جس کا ماضی شاندار، حال خوش آئند اور مستقبل روشن ہے۔ اردو کا ہر شاعر الامعدودے گیسوئے غزل کا اسیر رہا ہے۔ خواص کی ہی نہیں یہ عوام کی بھی مقبول ترین اور پسندیدہ صنف ہے۔ آج کے مشینی دور میں انسان کے پاس وقت نہیں، اس لئے بھی طویل قصے کہانیوں کے بجائے قاری غزل جیسے ایجاز واختصار کے فن میں اپنے لئے سکون قلب تلاش کر رہا ہے۔ غزل وہ صنف ہے جو بے چین دلوں کو سکون اور تھکن میں راحت دیتی ہے۔ کانوں میں رس گھولتی ہے، بلکہ مایوسی میں امید کی کرن بھی ہے۔ زندگی کا سلیقہ بھی سکھاتی ہے اور راز حیات بھی بتاتی ہے۔ زیست کے فلسفے بھی پڑھاتی ہے اور تنہا راہ چلنے والوں کی ہم سفر بھی بن جاتی ہے۔ تلمیع کی مثال میں پیش کی جانے والی امیر خسرو کی غزل، اردو کے ابتدائی خدوخال میں بھی اتنی ہی حسین اور دلکش ہے جتنی کہ آج کی پختہ تر اور بالیدہ زبان اور اسلوب میں دل نشیں ہے۔ اسی غزل کے زلفوں کی مشاطگی میں کوئی خدائے سخن بن گیا تو کوئی استاد ریختہ۔ انسانی زندگی کے نئے باب کھلتے گئے تو غزل اپنا دائرہ بھی بڑھاتی گئی۔ یہاں تک کہ اس کے دامن سے یہ داغ بھی ڈھل گیا کہ غزل عورتوں سے یا عورتوں کی بات کرنے کا نام ہے۔ اب یہ 'تنگنائے' سے نکل کر وسیع تر ہو گئی ہے۔ اب یہ انسان کے دکھ درد، رنج والم محن وآزمائش، لوازمات زندگی، مسائل حیات وروزگار گویا ہر حال میں انسان کے ساتھ برابر کی شریک ہے۔ تصوف کا سبق بھی اسے ازبر ہے اور خودی کا درس بھی۔ محبوب کی سرگوشی اور معشوق کے غمزے بھی۔ جدائی کے نالے بھی اور زندگی کی بے ثباتی بھی۔ یہ زمانے کے نشیب وفراز سے نہ صرف آگاہ ہے بلکہ ہر دور کی سماجی، تہذیبی اور سیاسی تاریخ کی گواہ بھی ہے۔ ترقی پسندی آئی تو اس کے ساتھ ہو لیا، جدیدیت آئی تو اس کے رنگ میں ڈھل گئی، مگر اپنی شناخت برقرار رکھتے ہوئے دوسروں کو بھی شناخت دیتی رہی۔ لیکن بڑی عجیب بات یہ ہے کہ غزل کے معنی کیا ہیں اس سلسلے میں آغاز سے لے کر آج تک کوئی نتیجہ قائم نہیں کیا جاسکا ہے۔ عام رائے یہی ہے کہ غزل کے معنی عورتوں سے یا عورتوں سے متعلق باتیں کرنا ہے لیکن میں کہتا ہوں اس کے معنی عورتوں سے باتیں کرنا نہیں ہے۔ تو آخر غزل کیا ہے؟

غزل عربی لفظ ہے اور غَزَلَ بروزن ضَرَبَ یَضرِبُ کے معنی میں صاحب المنجد نے کاتنا لکھا ہے، جبکہ غَزِلَ بروزن سَمِعَ یَسمَعُ کے معنی عورتوں سے باتیں کرنا، عورتوں کی خوبصورتی اور جمال کی تعریف کرنا، ان سے عشق بازی کرنا درج ہے۔ اسی سے ہے غَازَلَ المرأۃَ (عورت سے محبت و پیار کی باتیں کر کے پھسلانا)، تغَزَّل بتکلف عشق بازی کرنا اور الغَزَل جو اردو میں بطور صنف شاعری مستعمل ہے، یہ مصدر ہے اور اس کے معنی ہیں عورتوں سے لہو ولعب۔ اور غزِل کا اسم فاعل ہے الغازِلُ یعنی عورتوں سے پیار ومحبت کی باتیں کرنے والا۔ دوسرا معنی ''کوشش میں کمزوری'' بھی ہے۔ اس کو الغزِیْلُ بھی کہتے ہیں۔ لفظ 'غزل' کے حوالے سے محمد عبداللہ خان خویشگی 'فرہنگ عامرہ' میں لکھتے ہیں: عاشقانہ اشعار کی ایک قسم، جمع غزلیات، عورتوں کے ساتھ گفتگو اور عشق، جبکہ شان الحق حقی نے 'فرہنگ تلفظ' میں پیار کے بول، اظہار محبت، عاشقانہ گفتگو، عشقیہ کلام اور نظم کی ایک صنف جو ایک ہی زمین میں متفرق اشعار پر مشتمل ہوتی ہے جن میں معنوی ربط ضرور نہیں، لکھا ہے۔

اس سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں۔ اولاً یہ کہ عربی میں غَزَلَ کے معنی عورتوں سے باتیں کرنا نہیں ہے۔ اس کے لئے عربی میں لفظ غزِل بروزن باب سَمِعَ ہے۔ اگر ہم اردو میں غزِلَ کے ''ل'' کو ساکن کر دیں تو یہ غَزَلْ نہیں بلکہ غزِلْ ہوگا۔ دوسری طرف جو لفظ عربی میں الغَزَلْ ہے اس کے معنی عورتوں سے لہو ولعب ہے۔ ایسے میں عورتوں سے یا عورتوں کی باتیں کرنے کے معنی میں لفظ ''غزل'' کو استعمال کرنا ہو تو اس کا تلفظ غَزَلْ نہیں غزِلْ ہونا چاہئے اور اگر ہم غَزَلْ کہنے پر مصر ہوں تو پھر اس کے معنی عورتوں سے لہو ولعب ہی تسلیم کرنا ہوگا۔ ممکن ہے غزل کا تصور دینے والے کے ذہن میں لہو ولعب کے معنی ہی ہوں۔ لہو ولعب سے مراد کھیل کود، بازی، نیک کام سے روکنے والی چیز، تفریحات، بے فکری کی اوقات گزاری وغیرہ ہے۔ شاعری بھی اپنے بیشتر سرمایے کے حساب سے اسی زمرے میں آتی ہے۔

بہر کیف ہمارے سامنے اب ایک لفظ بچ جاتا ہے جوان دونوں معنوں سے زیادہ بہتر ہے اور غزل کو اسی معنی میں لیا جانا چاہئے۔ یہ معنی غزل کو عورتوں کے ذکر تک محدود بھی نہیں کرتا۔ وہ لفظ غَزَلَ بروزن ضَرَبَ یَضْرِبُ ہے اور اس کے معنی ہیں کاتنا۔ جیسے غزل الصوف (اون کاتنا) یہ معنی مراد لینے سے ہمیں بہت سی راحتیں مل جائیں گی۔ ہمیں یہ کہنے سے نجات بھی مل جائے گی کہ 'غزل کا معنی تو عورتوں سے یا عورتوں کی باتیں کرنا ہے لیکن غزل کا دامن آج بہت وسیع ہو چکا ہے اور اس میں ہر طرح کے مضامین و موضوعات شامل کئے جانے لگے ہیں۔' فی الحقیقت آج ایسا نہیں ہوا ہے۔ پورے غزلیہ سرمایے کا جائزہ لیں، ہر جگہ غزل کا موجودہ معنی آپ کا منہ تکتا ہوا نظر آئے گا۔ ہاں عورتوں سے متعلق باتیں ہماری قدیم غزلوں میں بڑی مقدار موجود میں ہیں لیکن نہ تو ولی کی تمام تر شاعری حسن و عشق اور گل و بلبل پر مشتمل ہے اور نہ ہی میرؔ، غالبؔ، ذوقؔ، مومنؔ، اصغرؔ، دردؔ، مصحفیؔ، انشاءؔ، سوداؔ، آتشؔ و ناسخؔ یا شادؔ وغیرہ کی شاعری صد فیصد عورتوں کا طواف کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ البتہ لکھنؤ والوں نے ایک عہد میں خوشحالی کے نام پر ایسی لاابالی کی فصل کاٹی کہ شاعری ابتذال و رکاکت کی سرحدوں کو عبور کر گئی لیکن یہ شاعری کا ما حصل نہیں ہے۔

میں نے عرض کیا کہ غزل کا معنی (اون) کاتنا مراد لیا جائے کیونکہ یہ زیادہ موزوں اور مناسب ہے۔ اون کاتنے یا سوت کاتنے کا عمل جو پچھلے زمانے میں ہوتا تھا ایک تو مشقت بھرا ہوتا تھا دوسرے بڑے انہماک کا طالب بھی تھا۔ ہاتھوں سے سوت کاتنے کے عمل میں چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں ''رسی'' تیار ہوتی تھی۔ اس میں انہماک، مشقت اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں اس کا تیار ہونا غزل کی ہیئت یعنی ہر ایک شعر کا اکائی کی صورت میں جدا جدا ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ فن غزل جس انہماک اور مشقت کا طلب گار ہے وہ روشن ہے۔ کیا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہی غزل کا عمل ہے اور صنف کی صورت میں غزل اسی سے عبارت ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ بعض ناقدین نے غزل کے مروجہ معنی و مفہوم سے پہلے بھی اختلاف کیا ہے لیکن ان کی باتیں صرف اختلاف یا عدم اتفاق تک رہی ہیں۔ اس سلسلے میں دو ناقدین کی آرا کو خصوصی طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ ایک عبادت بریلوی اور دوسرے محمد حسن۔ عبادت بریلوی کے الفاظ میں:

> ''......غزل کی یہ تشریح مکمل اور ہمہ گیر نہیں ہے۔ اس میں بہت کچھ اضافے کی ضرورت ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ انسانی زندگی میں عشق و محبت کے جذبات بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کی حیثیت بنیادی ہے۔ ان جذبات کے محرکات میں صنف لطیف کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اس لئے غزل کو ''عام طور پر'' عشق و محبت اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی مختلف ذہنی کیفیات اور جذباتی واردات کا ترجمان اور عکاس سمجھ لیا گیا ہے......لیکن غزل کو صرف ان موضوعات کی ترجمانی تک محدود سمجھنا اور صرف اس وجہ سے اس میں دلچسپی لینا صنف غزل کی وسعتوں کو سمجھنے اور اس کے جمالیاتی پہلوؤں کو محسوس کرنے سے ہاتھ دھو لینا ہے۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ صنف غزل کی بنیادی خصوصیات کا خون کر دیتے ہیں اور اسی لیے وہ صنف غزل کی اہمیت کا صحیح اندازہ نہیں لگا پاتے۔ غزل صرف عشق و محبت ہی تک محدود نہیں ہے۔ اس میں ان موضوعات کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ اس میں ان موضوعات کے ساتھ ساتھ زندگی کے متنوع پہلوؤں کا احساس اور اس کی ترجمانی بھی موجود ہے۔''

اسی بات کا اعادہ انہوں نے اپنی دوسری کتاب ''شاعری کیا ہے؟'' میں کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

> ''اگر غزل کا مطلب صرف عورتوں سے یا عورتوں کے بارے میں باتیں کرنا ہے تو شاید دبستان لکھنؤ کے وہ شعرا غزل کے سب سے بڑے شاعر سمجھے جائیں گے جنہوں نے عورت اور اس سے متعلق کسی پہلو کو بھی چھوڑا نہیں ہے بلکہ جن کی شاعری میں وہ سب کچھ بھی موجود ہے جس کو عملی طور پر کرتے تو سب ہیں لیکن جس کے متعلق بات چیت اور گفتگو کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔ لیکن دبستان لکھنؤ کے ان شاعروں نے جن غزلوں کی تخلیق کی ہے ان میں اس صنف کا صحیح مزاج نہیں ہے۔ اس کی اصل روح ان میں نظر نہیں آتی............اس تعریف کو غزل کا معیار اور اس کی بنیاد قرار نہیں دیا جا سکتا۔''

اب محمد حسن کا غزل سے متعلق نظریہ ملاحظہ فرمائیں:

> ''بڑا بے خبر تھا وہ شخص جس نے غزل کو سخن باز ناں گفتن یا عورتوں سے یا ان کے بارے میں باتیں کرنا بتایا تھا۔ وہ تو شاید خود سے باتیں

کرنے کے رمز سے بھی واقف نہ تھا۔ ورنہ ایسی پھوہڑ بات نہ کہتا۔ غزل اپنے سے یا اپنے بارے میں زیادہ بات کرتی ہے۔ عورت سے مراد اگر خود نگارِ حیات ہی ہو تو البتہ بات دیگر ہے۔''

محمد حسن نے عبادت بریلوی سے ایک قدم آگے بڑھ کر شدید احتجاج کرتے ہوئے غزل کو 'سخن باز ناں گفتن' کہنے والے کو 'بے خبر و ناواقف' اور اس معنی کو 'پھوہڑ بات' قرار دے دیا لیکن وہ اس سے آگے نہیں بڑھ سکے بلکہ رجعت قہقری کرتے ہوئے اپنی جگہ پر واپس آ گئے اور اسی عورت کو ایک دوسرے روپ میں کھینچ کر سامنے لا کھڑا کیا۔ اگر اس عمل سے وہ گریز کرتے تو غزل کا کوئی مثبت معنی تلاش کر لیتے۔

غزل کے مادۂ اشتقاق کے حوالے سے ایک اور توضیح یا تعریف کتابوں میں ملتی ہے۔ یہ قول کسی ایرانی کا ہے۔ اس کے مطابق غزل کا تعلق غزال (ہرن) سے ہے۔ اس نے توجیہہ یہ دی ہے کہ ہرن کو جب کوئی شکاری تیر مارتا ہے تو وہ زخمی ہو کر بھاگتا ہے چوکڑی بھرتا ہے لیکن زخم خوردہ ہرن شدت تکلیف سے مجبور ہو کر گر پڑتا ہے ''اس وقت غزال کی آنکھوں میں جو حسرت ہوتی ہے اس کا نام غزل ہے'' اس 'تعریف' کو نقل کرتے ہوئے عبادت بریلوی نے اسے بڑی ہی پہلو دار کہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہ تعریف غزل کے مزاج کو بڑی حد تک واضح کر دیتی ہے۔ درحقیقت اس میں غزال کا تیر کھانا، تیر کھا کر زخمی ہونا، زخمی ہو کر گر جانا، گر کر تڑپنا، تڑپ کر جان دے دینا اور جان دینے کے عالم میں نہ جانے کیا کیا کچھ سوچنا ان سب باتوں میں درد و کرب، مایوسی و ناکامی اور حزن و یاس کی جو ملی جلی کیفیات ہیں ان کا تعلق غزل اور اس کے مزاج سے ہے۔ اور غزال کی مثال دے کر غزل کی یہ تعریف کرنے والا درحقیقت اسی صورتحال کو واضح کرنا چاہتا ہے۔

یہ تعریف غزل کی بڑی ہی پہلو دار تعریف ہے۔ اس کی بنیاد انسانی زندگی کے ایسے بنیادی حقائق ہیں جو غزل کے مزاج کی جان ہیں۔ اس میں بنیادی حقیقت تو یہ ہے کہ انسانی زندگی غم کا نام ہے۔ اس میں درد ہی درد ہے۔ شروع سے آخر تک حسرت ہی حسرت ہے۔
''

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زخم خوردہ ہرن کی آنکھوں میں حسرت ہی کیوں وحشت بھی تو ہوگی؟ حیرت ہے کہ اس ایرانی کو جس نے غزل کی یہ تعریف پیش کی ہے اور ساتھ ہی عبادت بریلوی کو جنھوں نے اس کی توضیح میں زمین و آسمان ایک کر دئے ہیں، زندگی یاس و حسرت کا منبع، مرقع، مستقر اور مرجع نظر آتی ہے۔ دراصل عبادت بریلوی کو مذکورہ ایرانی کی توجیہہ بھا گئی اور اسے انہوں نے اپنی آنکھوں کا سرمہ بنا لیا۔ ایسے میں انہیں زندگی بھی اسی حسرت سے عبارت نظر آئی۔ کیا مرنے والے ہرن کی آنکھوں میں صرف حسرت ہی ہو سکتی ہے؟ کیا غزل کا مزاج حسرت ناک ہے اور کیا غزل زندگی کے صرف اسی حقیقت کو بیان کرتی ہے؟ عبادت بریلوی نے اپنے نظریے کو سچ ثابت کرنے کے لیے منفی رویہ اختیار کر لیا ہے۔ یہاں دو باتوں سے بحث کی جا سکتی ہے۔ ایک یہ کہ غزل کی مذکورہ تعریف درست ہے یا نہیں اور دوسرا اسی سے وابستہ یہ سوال کہ عبادت بریلوی کی توضیح کس حد تک مناسب ہے۔ اولاً غزل کی تعریف اوپر بیان کی جا چکی۔ ثانیۂ غزال کی اس کہانی میں شروع سے آخر تک وحشت اور دردنا کی ہے جسے حسرت کا نام دیا گیا ہے۔ غزل کا نازک فن اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس کے ساتھ ہی عبادت بریلوی سے تعلق رکھنے والا سوال خود بخود حل ہو جاتا ہے تاہم اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اس نظریے میں کوئی منطقی استدلال نہیں ہے۔ محض تخیل کے زور پر مرتے ہوئے ہرن کی آنکھوں کی یاسیت کو ''لطیف بیانیہ'' کہہ کر غزل کے اشارے و کنایے والے فن کے ساتھ ربط پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جہاں تک بات اشارے و کنایے کی ہے اس کے لیے ایک ہرن کو مارنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ تو غزل کے فن کا مطالبہ ہے جسے ہر غزل گو کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ یہ ہمارا وضع کردہ اصول ہے جو غزل سے پہلے بھی تھا کیونکہ یہ غزل سے مخصوص نہیں ہے، نثر میں بھی اشارے کنایے ہوتے ہیں اور ان سے نثر دل نشیں بن جاتی ہے۔ یہ بلیغ گفتگو کی خاصیت مانے جاتے ہیں اور بات نثر میں ہو یا نظم میں ہر جگہ اپنا جوہر دکھاتے ہیں۔ رہ گئی بات زندگی کے حسرت و یاس میں ڈوبے ہونے کی تو اس کا اندازہ ہر آدمی اس طور پر لگا سکتا ہے کہ وہ دن بھر میں کتنی دیر ہنستا اور خوش رہتا ہے اور کتنی بار روتا و بسورتا ہے۔ یا اس کی بیوی اور بچے پورے دن میں کتنا ہنستے اور مسرور رہتے ہیں یا روتے ہیں اور انہیں دیکھ کر آپ کتنا روتے ہیں؟ بات دراصل یہ ہے کہ عبادت بریلوی غزل کے مروجہ معنی و مفہوم سے متنفر ہیں۔ اس صورت میں انہوں نے مذکورہ ایرانی کی اس تعریف میں جائے پناہ ڈھونڈ لی ہے۔

بہر کیف ’غزل‘ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ قصیدے کی تشبیب سے پیدا ہوئی ہے اور پہلی مرتبہ فارسی شاعر رودکیؔ نے اسے بطور صنف استعمال کیا یا یوں کہیں کہ قصیدے سے الگ کیا۔ بقول عبادت بریلوی ’’عشقیہ مضامین قصیدوں کی تشبیب میں پیش کیے جاتے تھے۔ رودکیؔ نے قصیدے کی اس تشبیب کو الگ کر کے صنف غزل کی داغ بیل ڈالی‘‘ حالانکہ تشبیب کے معانی اور غزل کے قصیدے سے مستخرج ہونے کے معاملے میں قدرے اختلاف ہے۔ شان الحق حقی نے ’فرہنگ تلفظ‘ میں تشبیب کے معنیٰ ’ذکر شباب، قصیدے کے ابتدائی اشعار جو عموماً بہاریہ ہوتے تھے‘، لکھا ہے۔ عبداللہ خان خویشگی نے ’ایام شباب کا تذکرہ کرنا، آگ سلگانا، عشق کا بیان کرنا، معشوق کی صفت میں غزل کہنا، کسی قصیدے میں ممدوح کی تعریف بیان کرنے سے پہلے تمہید باندھنا‘ اور المنجد میں شَبَّبَ وَتَشَبَّبَ کے معنیٰ ’’جوانی اور کھیل کود کے ایام کا ذکر کرنا لکھا ہے اور قَصِیدَۃٌ کے ساتھ اس کے معنیٰ ’’عورتوں کے ذکر سے قصیدہ کو مزین کرنا۔ مدحیہ قصائد کے شروع میں تشبیب کا رواج تھا مگر پھر ہر چیز کی ابتدا کو تشبیب کہنے لگے۔‘‘ لکھا ہے۔ عبادت بریلوی نے اس معنیٰ کو ترجیح دی ہے کہ تشبیب میں جذبۂ عشق کا بیان ہوتا تھا جب کہ وزیر آغا لکھتے ہیں:

’’......ساتویں صدی ہجری کے شمس الدین محمد بن قیس الراضی نے پہلی بار تشبیب، نسیب اور غزل ایسی اصطلاح کے مفاہیم کو واضح کرتے ہوئے لکھا تھا کہ تشبیب میں شاعر آپ بیتی کا انداز اختیار کرتا ہے جبکہ نسیب میں وہ جگ بیتی کی روش اختیار کرتے ہوئے فرضی اور روایتی محبت کو اپنا موضوع بناتا ہے۔ غزل کے بارے میں اس نے لکھا کہ یہ ’حدیث زناں وصفت عشق بازی باایشاں‘ ہے۔ اصطلاحات کی اس توضیح سے یہ خیال عام ہوا کہ غزل عورت سے باتیں کرنے کی ایک صورت ہے۔ اور یہ خیال ایک طویل مدت تک رائج رہا۔ اردو غزل کی وسعت کے پیش نظر اردو کے ایک ممتاز نقاد پروفیسر مسعود حسن رضوی نے اس توضیح میں قدرے کشادگی پیدا کی اور اسے عورتوں سے باتیں کرنے کے بجائے عورتوں کی باتیں کرنا قرار دیا لیکن بات نہ بن سکی۔‘‘

مذکورہ بالا اقتباس کے آخری جملے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وزیر آغا غزل کی اس تعریف سے مطمئن نہیں ہیں۔ وہ غزل کو تشبیب سے نکلی ہوئی بھی تصور نہیں کرتے۔ انہی کے لفظوں میں دیکھیں:

’’بات دراصل یہ ہے کہ تشبیب، نسیب یا قول نظم کی ایک صورت ہے اور غزل سے مزاجاً قطعاً مختلف ہے۔ قصیدے کے ابتدائی حصے میں شاعر محبت کی ایک حکایت پیش کرتا ہے اور یکایک اسے اپنی جوانی کے ایام یاد آجاتے ہیں۔ پھر اس کے ذہن میں محبوبہ کا سراپا طلوع ہوتا ہے۔ اور وہ وصال اور فراق کی باتیں کرنے لگتا ہے۔ بے شک قصیدے کے اس ابتدائی حصے اور بعد کی فارسی غزل میں ہیئت کے اعتبار سے مماثلت موجود ہے تاہم مزاج کے اعتبار سے دونوں میں بڑا فرق ہے۔ اور یہ فرق محض نظم اور غزل کا فرق نہیں بلکہ عرب اور ایران کا فرق بھی ہے۔ عرب کا باشندہ صحرا میں زندگی گزارتا تھا اور مسلسل سفر اور آوارہ خرامی اس کا مسلک تھا اور اس کے نتیجے میں ہر روز اسے نئی سے نئی صورت حال سے متصادم ہونا پڑتا تھا۔ گویا وہ بنیادی طور پر ایک سیاح یا آوارہ گرد تھا۔ وہ حقائق کے تجزیے کی مدد سے اور تجربات سے گزر کر کسی نتیجے پر پہنچتا تھا۔ ایسے خاص مزاج کے تحت عربی شاعری میں قصیدہ ایسی صنف ہی رائج ہوسکتی تھی جو استقرائی طریق فکر کی غماز تھی۔ دوسری طرف ایران قدیم زمانے ہی سے ایک منضبط اور منظم معاشرے کا علم بردار تھا یعنی اگرچہ ایران میں انفرادیت کا عمل بھی وجود میں آگیا تھا تاہم یہاں کا فرد بحیثیت مجموعی سماج کی ’’کل‘‘ میں محض ایک پرزے کی حیثیت رکھتا تھا۔ چنانچہ وہ خود حقائق سے متصادم ہونے اور تجربات حاصل کرنے کی بہ نسبت کل یا سوسائٹی کے اجتماعی تجربات سے اخذ و اکتساب کی طرف زیادہ مائل تھا۔ اسی لیے اس کے یہاں استخراجی طریق کار کو تحریک ملی اور اس کے ادب میں غزل ایسی صنف مروج ہوئی۔ جو فرد اور سوسائٹی، جزو اور کل کے ربط باہم کی غماز تھی۔ پھر یہ ایک بات بھی قابل غور ہے کہ ایران میں ابتدا ہی سے ایک ایسی صنف رائج تھی جسے ’’چامہ‘‘ کا نام ملا تھا اور جو ہندی گیت کی طرح بیک وقت شاعری بھی تھی اور موسیقی بھی۔ ایران کے دیہات میں چامہ بہت مقبول تھا۔ بالخصوص عورتوں کے کہے ہوئے چامہ زیادہ دل کش اور پسندیدہ ہوتے تھے۔ چونکہ غزل مزاجاً گیت کی اساس پر استوار ہے اس لیے غزل کو عربی تشبیب کے بجائے ایرانی چامہ سے منسلک کرنا زیادہ قرین قیاس ہے۔‘‘

وزیر آغا نے غزل کا ایک سرا قصیدے سے اور دوسرا چامہ سے جوڑ دیا ہے۔ یہ بعید بات بھی نہیں ہے۔ ابتدا میں غزل نے جب اپنی وجودی شکل

اختیار کی ہوگی تو ایسا نہیں ہے کہ اسے تشبیب کے معنی ومطالب میں ڈھالنے یا محدود رکھنے کی کوشش کی گئی ہوگی بلکہ غزل کے مزاج سے ہم آہنگ جو بھی قدریں ہوں گی ان کے اثرات غزل پر مرتب ہوئے ہوں گے۔ان باتوں سے بہر حال یہ واضح ہوجاتا ہے کہ غزل کا تعلق کسی حد تک قصیدے کی تشبیب سے بھی ہے مگر یہ تعلق غزل سے معنوی ربط نہیں رکھتا بلکہ ہیئتی اعتبار سے ہے۔یہی وہ مقام ہے جہاں ہم نے دھوکہ کھایا اور غزل کے معنی عورتوں سے باتیں کرنا قرار دے دیا۔ یہاں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ رودکی نے تشبیب سے غزل کو متخرج نہیں کیا بلکہ اس نے ایک الگ صنف ایجاد کی جو ہیئت میں تشبیب سے مشابہ تھی اور مزاج میں ''چامہ'' سے۔ جہاں تک موضوعات کی بات ہے تو یہ درست ہے کہ پہلے تشبیب میں صرف عشقیہ جذبات ہی بیان ہوتے تھے بعد میں اس کا دائرہ وسیع ہوا۔عظیم الحق جنیدی نے تشبیب کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

''......عربی قصائد میں تمہید میں عشقیہ اشعار ہوتے تھے اسی لئے اس کا نام تشبیب رکھا گیا۔تشبیب کے معنی ہیں شباب کا ذکر۔اب قصیدے کی تمہید میں بہار وخزاں کا ذکر، معاملات ارضی وسماوی کا تذکرہ اور بے ثباتی دنیا کا بیان کرتے ہیں اور مضمون تشبیب کے اعتبار سے قصیدے کو بہاریہ، عشقیہ، وعظیہ وغیرہ کہتے ہیں۔''

اس کے علاوہ کچھ اہل علم وادب شکایت زمانہ کو بھی تشبیب میں شامل کرتے ہیں۔مناظر فطرت کو بھی تشبیب میں جگہ دی جاتی رہی ہے۔خواجہ اکرام قصیدہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تشبیب سے مراد بہاریہ کلام ہے۔تشبیب کا لفظی معنی حسن اور جوانی ہے۔عربی شعرا قصیدے کے اس حصے میں حسن وعشق کے موضوعات قلمبند کرتے تھے۔فارسی اور اردو قصیدوں میں بھی اسی مناسبت سے عشقیہ کلام کو اولیت دی گئی لیکن ساتھ ہی دیگر موضوعات بھی شامل کئے گئے مثلاً موسم بہار، مناظر فطرت، واردات حسن وعشق، رندی وسرمستی، بے ثباتی دنیا، شکوہ روزگار، گردش چرخ، پندونصائح، اخلاق وموعظت، آلام روزگار، ذاتی وملکی حالات، تاریخی واقعات وغیرہ اور ہیئت، نجوم، منطق، فلسفہ، حکمت، اخلاق، تصوف، موسیقی اور دیگر علوم وفنون کے تصورات واصطلاحات بھی اکثر تشبیب میں استعمال کئے گئے ہیں۔''

گویا غزل کی طرح تشبیب بھی حسن وجوانی کے ذکر سے مخصوص نہیں ہے۔اس طرح اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ غزل کا تعلق تشبیب سے ہے تو بھی یہ تمام باتیں اس پر دلالت کرتی ہیں کہ غزل کو حسن وعشق کی باتوں تک محدود نہیں کیا جانا چاہئے۔یہ غزل کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔خصوصاً آج کے دور میں جب کہ غزل نے تمام تر مضامین اور موضوعات کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے، اس طرح کی توضیح کہ غزل کے معنی یوں تو عورت سے باتیں یا عورتوں کی باتیں کرنے ہیں لیکن آج کی غزل نے تمام موضوعات کا احاطہ کررکھا ہے، محض ''زیب داستاں'' معلوم ہوتی ہے۔

بہر حال غزل کے ہیئت کی بات کریں تو تشبیب کی طرح اس کا پہلا شعر ہم قافیہ وہم ردیف ہوتا ہے۔اوراس کو مطلع کہتے ہیں مثلاً

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا　　　کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

اس شعر میں 'کا' ردیف ہے اور تحریر، تصویر قافیہ ہے۔قافیہ اس ہم الفاظ کو کہتے ہیں جو غزل کے مطلع کے دونوں مصرعوں اور غزل کے ہر شعر کے آخر میں ردیف سے پہلے آتا ہے۔یہ ہم وزن الفاظ ہوتے ہیں۔

غزل میں اگر دو شعر ہم قافیہ وہم ردیف ہوں تو پہلے کو مطلع اور دوسرے کو حسن مطلع کہتے ہیں۔اور غزل کا آخری شعر جس میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے اسے مقطع کہتے ہیں۔

غزل کم ازکم پانچ اشعار پر مشتمل ہوتی ہے اور اس کا ہر شعر ایک دوسرے سے مفہوم کے اعتبار سے جدا ہوتا ہے۔یعنی غزل کے ہر شعر میں شاعر الگ الگ بات کہتا ہے۔یہی غزل کا حسن ہے۔حالانکہ معروف ناقد کلیم الدین احمد نے اسے عیب قرار دیتے ہوئے غزل کو نیم وحشی صنف سخن قرار دیا تھا لیکن ہمیں سمجھنا چاہئے کہ غزل نظم نہیں جو جس کا ہر شعر ایک دوسرے سے مربوط ہوگا۔دراصل غزل کا انتشار خیالی ہی اس کا حسن ہے۔

غزل کے لئے بحر کی قید نہیں ہوتی۔غزل ہر بحر میں کہی جاتی ہے۔اشعار کی تعداد بھی متعین نہیں ہوتی۔اردو شاعری میں دوغزلہ اور سہ غزلہ کہنے کی بھی روایت رہی ہے۔دوغزلہ میں زیادہ سے زیادہ ۱۸ اشعار کہنے کے بعد اسی زمین میں ایک اور مطلع پیش کر کے شاعر مزید اشعار کہتا ہے۔

غزل ایجاز واختصار کا فن ہے۔اس میں اشارے وکنایے میں دو مصروں کے درمیان بڑی سے بڑی بات کہہ دی جاتی ہے۔یہ کوزے میں

سمندر کو سمونے کا فن ہے۔ایک افسانہ نگار کئی صفحات پر مشتمل ایک افسانے میں جو بات کہتا ہے غزل گو اسے صرف ایک شعر میں پیش کر دیتا ہے۔ اسی لئے غزل کو مشکل ترین فن بھی کہا جاتا ہے۔غزل کے معجز بیان فن کے بارے میں جاں نثار اختر کا یہ شعر ہماری بھرپور رہنمائی کرتا ہے اور دلیل فراہم کرتا ہے:

ہم سے پوچھو کہ غزل کیا ہے غزل کا فن کیا　چند لفظوں میں کوئی آگ چھپا دی جائے

ڈاکٹر توقیر عالم توقیر
اسسٹنٹ پروفیسر
شعبۂ اردو، مولانا مظہر الحق عربی و فارسی یونیورسٹی، پٹنہ